خطبات سید العلماءؒ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

(۱)

اسلام دینِ عمل ہے

(بتاریخ ۱۱ر نومبر ۱۹۷۷ء ۹ ربجے شب، فیض آباد)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ اَبِی الۡقَاسِمِ مُحَمَّدٍ خَاتِمِ النَّبِیِّیۡنَ۔ وَ اٰلِہِ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاھِرِیۡنَ الۡمَعۡصُوۡمِیۡنَ۔

اَمَّا بَعۡدُ

فَقَدۡ قَالَ اللّٰہُ سُبۡحَانَہٗ فِی کِتَابِہِ الۡمُبِیۡنَ وَھُوَ اَصۡدَقُ الصَّادِقِیۡنَ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔

یَوۡمَئِذٍ یَّصۡدُرُ النَّاسُ اَشۡتَاتًا لِّیُرَوۡا اَعۡمَالَھُمۡ فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ۔ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔

قرآن مجید کے تیئسویں پارے میں مختصر ترین تو نہیں، مگر مختصر سوروں میں ''سورہ زلزال'' ترتیب قرآنی میں سورۂ عادیات سے پہلے ہے۔ اسی میں کی دو آیتیں ہیں جن کو میں نے عنوان کلام قرار دیا ہے۔

ارشاد ہو رہا ہے:

اس دن گروہ گروہ جماعتیں انسانوں کی برآمد ہوں گی۔ تا کہ ان کے اعمال انھیں دکھائے جائیں، جس نے ذرّہ بھر بھی برا عمل کیا ہے وہ اسے دیکھے گا۔

''اعمال دکھائے جائیں گے'' یعنی ہر ایک کے اعمال کا انجام اس کے سامنے آئے گا۔

میرا موضوع ''اسلام دین عمل ہے'' اس میں دو شعبے ہیں:

ایک شعبہ دنیاوی مقاصد کے لئے اور دوسرا اخروی مقاصد کے لئے چونکہ میرے بیان کے لئے دو مجلسیں ہیں اور موضوع وسیع ہے، اس لئے میں ان دونوں شعبوں کو دو مجلسوں پر تقسیم کرتا ہوں۔ اس وقت پہلا شعبہ عمل کا بیان کرنا ہے جو دنیا سے متعلق ہے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ دنیا سے ایک عالم دین کو کیا مطلب؟ مگر یہ کسی اور دین کا عالم ہو تو اس سے مطالبہ ہو سکتا ہے کہ وہ دنیا سے مطلب نہ رکھے۔ لیکن جو کسی حد تک کہلاتا ہو ''دین اسلام کا عالم'' اس سے یہ مطالبہ درست نہ ہوگا کہ وہ دنیا سے الگ ہو جائے۔ اسلام نے دنیا کو اپنے دائرہ سے باہر نہیں رکھا تو ایک عالم اسلام کیونکر تلقین کر سکتا ہے کہ دنیا سے مطلب نہ رکھو۔ اگر کوئی یہ کہتا ہو کہ ہمیں دنیا کی ضرورت نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اسلام کا علم نہیں ہے۔

بے شک کلام امیرالمومنینؑ میں کثرت سے دنیا کی مذمت ہے مگر وہ اس دنیا کی ہے جو مقابل دین ہے۔ ورنہ ہم میں سے کون ہے جو یہ کہے کہ ہمیں دنیا کی کامیابی کی ضرورت نہیں ہے؟

دنیا کے مفادات کیا ہیں؟ مال دنیا، عزت دنیا اور اولاد۔ ان میں سردست مال دنیا ہی کے بارے میں عرض کرنا ہے۔

کوئی اظہار زہدوتقویٰ کے لئے کہے ہمیں مال کی ضرورت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں اوّل تو یہ صدا ہی کھوکھلی ہے۔ اگر پیسہ مل رہا ہو، پھر کہیں ہمیں ضرورت نہیں تو ایک بات ہے۔ ورنہ پھر عصمت بی بی، بے چادری کا مضمون ہے۔ لیکن اگر واقعی ذہنی طور پر کسی کو یہ تصور ہو کہ پیسے کی ضرورت نہیں ہے تو یہ تصور اسلام کے نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے اگر پیسے کا تصور نہ ہوتا تو قرآن میں تقریباً ہر جگہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا نام ایک ساتھ کیوں ہوتا حالانکہ واقعہ یہی ہے کہ جہاں جہاں صلوٰۃ کا ذکر ہے وہاں زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے۔

اسلام ''دین عمل'' ہونے کے ساتھ ''دین عقل'' ہے لہٰذا صاحبان عقل غور کریں کہ اس وقت ہمارا معاشرہ کیا ہے؟ شرائط زکوٰۃ کے لحاظ سے زکوٰۃ ہمارے یہاں کتنے آدمیوں پر واجب ہے۔ فیصدی شاید ایک ہو جس میں شرائط زکوٰۃ حاصل ہوں۔ نماز تو سب کو پڑھنا ہے اور زکوٰۃ دو ایک کو دینا ہے تو بلاغت قرآنی کا تقاضا یہ تھا کہ نماز کا حکم اگر سو جگہ پر ہو تو بس دو ایک جگہ زکوٰۃ کا بیان ہو لیکن قرآن میں تقریباً ہر جگہ صلوٰۃ کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم ہونا بتلاتا ہے کہ قرآن ایک ایسے سماج کی تشکیل چاہتا ہے جو مفلس اور قلاش نہ ہو۔ ایسا سماج جس میں ہر فرد پر جیسے نماز واجب ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی واجب ہو۔

ہاں اس ترقی یافتہ اور پھر سوشلزم وغیرہ کے تصورات سے متاثر دور میں کچھ لوگ فلسفۂ زکوٰۃ یہ قرار دیتے ہیں کہ زکوٰۃ کا حکم تو اسی واسطے ہے کہ پیسے زیادہ نہ ہونے پائیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر قوم کے پاس پیسہ کا نہ ہونا مدنظر ہوتا تو لینے والوں کو قوم کے اندر کیوں محدود کیا جاتا۔ حالانکہ مستحقین زکوٰۃ، فقراء ومساکین میں شرط ہے کہ وہ مومنین میں سے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ منظور نہیں کہ قوم کا روپیہ قوم کے اندر سے نکلے۔ مگر مطلوب یہ ہے کہ پیسہ ایک جگہ منجمد نہ ہو جائے جیسے خون تمام جسم میں گردش کرتا ہے اسی طرح پیسہ تمام قوم میں گردش کرتا رہے۔

پھر کوئی کہہ لے کہ پیسے کی مجھے ضرورت نہیں تو کیا روٹی کی بھی ضرورت نہیں ہے؟

بے شک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روٹی ذریعہ حیات یا مقصدِ حیات؟ اگر روٹی زندگی کا ذریعہ ہے تو اس کے بعد سوچنا ہوگا کہ مقصدِ حیات کیا ہے؟ اور یہ ظاہر ہے کہ مقصد کا درجہ اونچا ہوتا ہے۔ تو اب بلحاظ اہمیت تین درجے ہوں گے۔ پہلے روٹی، دوسرے زندگی تیسرے مقصد زندگی تو جس طرح روٹی سے زندگی اہم، اسی طرح زندگی سے مقصدِ زندگی اہم ہے۔ جب روٹی زندگی کی خاطر ہے تو پھر ایسی روٹی جس کے کھانے سے ہیضہ ہو جائے، حاصل کرنے

کے لائق نہ ہوگی۔ اور چونکہ زندگی سے بھی اہم اس کا مقصد ہے تو وہ روٹی بھی ترک کرنے کے قابل نہ ہوگی جو مقصد حیات کو نقصان پہنچائے مثلاً وہ روٹی جو کسی کی جان لے کر ملے یا وہ روٹی جو بے گناہوں کے گھر جلا کر ملے، وہ روٹی جو فتنہ وفساد برپا کر کے ملے، اس لئے چھوڑنے کے قابل ہوگی کہ وہ مقصد حیات کو نقصان پہنچاتی ہے اور یہیں سے رزق میں حلال وحرام کا فرق پیدا ہوگا اور جب روٹی کے نظام کے ساتھ جائز وناجائز کے امتیاز کی قید لگ جائے گی تو اس روٹی والے نظام سے اسلام گلے مل جائے گا۔

بہر حال روٹی کی ضرورت ناقابل انکار ہے مگر جس قوم کی عادت ہو۔ بغیر محنت کے روٹی ملنے کی اور خواہش یہی ہو کہ بغیر محنت کے روٹی مل جائے اس کے یہاں ایسے تصورات تراش لئے جاتے ہیں اور کبھی صحیح تصورات کا غلط استعمال کیا جاتا ہے کہ محنت ومشقت کرنا نہ پڑے اور روٹی مل جائے چنانچہ مذہبی حلقہ میں سب سے پہلے ایک تصوّر بے عملی کو نبھانے کے لئے سامنے لایا جاتا ہے یہ کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ مٹتا نہیں۔ مقدر میں فاقے ہیں تو فاقے کرنا پڑیں گے اور کھانا ملنا ہے تو مل کر رہے گا۔ محنت ومشقت سے کیا فائدہ؟

میں کہتا ہوں کہ کیا تقدیر کا مسئلہ صرف رزق کے معاملہ میں ہے؟ اگر آپ اس اصول کے قائل ہیں تو بچہ خدا نخواستہ بیمار ہو تو ڈاکٹر کے یہاں نہ جائیے۔ اگر زندہ رہنا ہے تو رہے گا۔ ڈاکٹر کے یہاں جانے سے کیا فائدہ؟

اگر کوئی مقدمہ عدالت میں ہو تو کسی وکیل کے پاس کیوں جائیے؟ اگر تقدیر میں ہوگا تو مقدمہ جیتئے گا ورنہ ہار جائیے گا۔

مگر ڈاکٹر کے یہاں جانا، دوا لانا، پھر شیشی کو حرکت دے کر دوا کا منھ تک پہنچانا۔ ایک سلسلۂ عمل کا ہے جس سے آپ بے نیاز نہیں ہیں۔ مقدمہ میں وکیل یا بیرسٹر کے یہاں دوڑے، عدالت کے چکر لگائے، تمام ذرائع فراہم کئے...... یہ سب کیا عمل کی منزلوں سے الگ ہے۔ ان سب منزلوں سے گذرنے کے بعد نتیجہ کے حصول کا انتظار ہوتا ہے۔

دور کیوں جائیے۔ اس وقت آپ مجلس میں آکر میرا بیان سن رہے ہیں تو دور دراز سے یا یہیں کہیں دور یا قریب سے، کسی سواری پر یا پیادہ راستہ طے کر کے آئے۔ زیادہ یا کم جو دشواری پیش آئی اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔ آرام سے اپنے گھر میں رہتے، تقدیر میں ہوتا تو مجلس سن لیتے۔

یہ سب مشورے اگر کوئی دے اور تقدیر کے مسئلہ کو سامنے رکھ کر دے تو آپ قبول نہ کریں بلکہ اس شخص کو شاید دیوانہ کہیں اور رزق کے معاملہ میں آپ تقدیر پرشاکر ہو کر سعی وعمل سے گریز کریں۔

حقیقت امر یہ ہے کہ بعض اوقات اصل تقدیر یہی ہے کہ تم علاج کرو تو مریض اچھا ہو، تجارت کرو تو نفع ہو۔ حضور والا ان تمام کوششوں کے بعد بھی مقصد حاصل نہ ہو، تب یہ کہنے کا حق ہے کہ ہماری تقدیر میں نہیں تھا۔

اب اگر سوال کیا جائے کہ دو طرح کی تقدیریں

کیوں رکھی گئیں؟ میں کہتا ہوں مشروط تقدیر اس لئے رکھی کہ بے عملی پیدا نہ ہو اور کچھ تقدیریں مطلق اس لئے رکھیں کہ تم خدا کو نہ بھولو اور اپنے ہی کو خدا نہ سمجھ لو اس لئے شریعت نے کہا دوا کرو اور پھر دعا بھی کرو دوا اپنے فرض کو ادا کرنے کے لئے اور دعا اس کی رحمت کو متوجہ کرنے کے لئے۔

تقدیر کا عقیدہ حق ہے مگر یہ تصور کہ اس بنیاد پر بے عملی کی زندگی حق بجانب قرار پائی ہے، بالکل غلط ہے۔

ایک دوسرا تصور یہ ہے کہ اللہ رزق کا ضامن ہے۔ جب اللہ ضامن ہے تو پھر ہم مشقت کیوں اٹھائیں؟ یہ سوال امام کے سامنے پیش ہوا جب آپ نے کسی سے فرمایا آخر تم کچھ کرتے کیوں نہیں؟ اس نے جواب دیا اللہ رزق کا ضامن ہے تو ہم کیوں مشقت کریں؟ حضرت نے فرمایا کہ اللہ نے اپنی ذمہ داری پوری کردی تم کو ہاتھ اور پاؤں دے کر اب اس کی ذمہ داری تم پر ہے کہ تم اپنے رزق کو ان کے ذریعہ حاصل کرو۔

بے شک حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی طرف دو شعر منسوب ہوئے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا جو بچہ کو شکم مادر میں غذا پہنچاتا ہے ہمیں غذا نہ پہنچائے گا؟

یہ اگر مولا کا کلام ہوتا تو ضرور غور طلب تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرت کا کلام نہیں ہے اور حقیقت کے لحاظ سے درست بھی نہیں ہے اس لئے کہ بچہ کو اللہ رزق اس وقت تک دیتا ہے، جب تک اپنی طرف سے قیدخانہ میں رکھتا ہے اور جب وہ اس دار دنیا کی کھلی فضا میں آ گیا تو اب ماں باپ کا فریضہ ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو پورا کریں اور اب استدلال کا رُخ پلٹ جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو بچہ کو بغیر انسانی عمل کے رزق نہ پہنچائے وہ ہم ایسے ہاتھ پیر والوں کو بغیرِ سعی و عمل رزق کیوں دے گا؟

جانور تک رزق حاصل کرنے کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔ جب جانور بغیر سعی و عمل کے نہیں کھاتا تو انسان بغیر سعی و عمل کے کیونکر کھا سکتا ہے؟

بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ جب ہمارے باپ دادا نے تجارت نہیں کی تو ہم یہ ٹکے ٹکے کی چیزیں کیونکر فروخت کریں۔ یہ ہماری بے عزتی ہے کہ ہم پھیری کریں یا دوکان لگائیں۔ جو یہ کہتے ہیں، وہ سنیں کہ آپ کے باپ دادا نے تو کبھی فاقے نہیں کئے تھے۔ یہ حضور والا کیوں فاقہ کرتے ہیں؟

باپ دادا نے ایسا نہیں کیا تھا، اس لئے کہ ان کے پاس مفت کی دولت تھی، انھیں ضرورت نہ تھی اب آپ کو ضرورت ہے تو آپ کو یہ سب کرنا چاہئے۔

اب دوسروں کی ذہنیت اور ان کے طرز عمل کی غلطی یہ ہے کہ کل تک وہ مرزا صاحب، میر صاحب، خان صاحب وغیرہ کہلاتے تھے اور جب سے وہ ترکاری بیچنے لگے، بسکٹ فروخت کرنے لگے تو اب ترکاری والے اور بسکٹ والے کہلانے لگے، میر صاحبی اور خان صاحبی ختم ہوگئی۔ آخر ان کے طرز عمل میں یہ تبدیلی کیوں پیدا ہوئی؟ ان کا یہ عمل ان کی غلط ذہنیت کا ترجمان ہے۔ لیکن انھیں اس کا برا نہ ماننا

چاہیئے۔ میں تو کہتا ہوں کہ جب تک وہ میر صاحب اور مرزا صاحب کہلاتے تھے، وہ ایک وصف اضافی کا اظہار تھا۔ اور اب جو ان کے کاروبار کے لحاظ سے ان کو پکارا جارہا ہے تو یہ جوہر ذاتی کا اعلان ہے جس پر انھیں فخر کرنا چاہیئے۔

ہمارے رہنمایان دین نے اپنے عمل سے ہمارے تصورات کی اصلاح کے لئے سرمایہ فراہم کردیا ہے۔ ہم زیادہ تقدیر کے قائل یا رسولؐ خدا اور امیر المومنینؑ؟ ہم خدا کے ضامن رزق ہونے پر زیادہ باایمان یا یہ لوگ؟ ہم زیادہ حقیقی معیار توکل کے جاننے والے یا یہ حضرات؟

پیغمبرؐ خدا نے رسالت سے پہلے اپنا تعارف دنیا سے بحیثیت تاجر کے کرایا ...... تجارت کی اس سے بڑی بلندی کیا ہوگی کہ بربنائے واقعہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک تاجر کو اللہ نے خاتم المرسلینؐ بنایا۔ اب اگر کوئی آدمی تاجر کو حقیر سمجھے تو بات کہاں جاتی ہے؟

اگر تجارت بری چیز ہوتی تو خالق بلند حقیقتوں کی تعبیر تجارت سے نہ کرتا مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْکُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ۔

''اے ایمان والو! کیا میں تمہیں بتاؤں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے۔''

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ۔

''وہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کرو۔''

محسوس ہوتا ہے کہ مخاطب وہ جماعت ہے جو تجارت پیشہ ہے یہاں تک کہ شہداء راہِ خدا کو میدان جنگ میں جو رفعت دی جارہی ہے وہ یوں کہ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔

''اللہ نے مول لیا مومنین سے ان کے جان و مال کو اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔''

یاد رکھنا چاہیئے کہ قیمت وہ ہوتی ہے جس کی نظر خریدار میں مالیت ہو۔ یہ عام مومنین تھے جن کا منتہائے نظر جنت ہے۔ ان کے نفوس کی قیمت جنت ہوگئی۔ لیکن اگر کوئی ایسا بلند نظر بندہ ہو کہ وہ بارگاہ الٰہی میں کہتا رہا ہو:

مَا عَبَدْتُکَ طَمَعًا فِیْ جَنَّتِکَ وَلَا خَوْفًا مِنْ النَّارِکَ وَلٰکِنْ وَجَدْتُکَ اَهْلًا لِّلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُکَ۔

''میں نے تیری عبادت تیری جنت کی لالچ میں نہیں کی، نہ تیری اس آگ کے ڈر سے کی ہے مگر میں نے تجھ کو عبادت کا حقدار پایا اس لئے تیری عبادت کی۔

کیا عبودیت کی نیازمندی میں اتنی بے نیازی کی شان کبھی تصور میں آسکتی تھی۔ بہرحال اس سے پتہ چل گیا کہ اس بندہ کی نظر میں جنت کوئی قیمت نہیں رکھتی تو اب اس کے نفس کی قیمت جنت کہاں ہوسکتی ہے؟ اس لئے قرآن جب اس کی قیمت بتائے گا تو جنت نہیں بلکہ رضائے الٰہی جس کا جنت ایک ثمرہ ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ۔

تو یہ اتنی بڑی قربانی بھی کہ خیبر وخندق کا جہاد بھی جو متحرک انداز کا تھا اتنا عظیم شاید نہ تھا۔ جتنی کہ یہ ساکت وساکن قربانی تھی کہ بستر رسولؐ پر فدیہ رسولؐ بنے رات بھر سوتے رہے یعنی علیؑ اگر کھلے ہوئے علیؑ ہوتے تو اتنے خطرہ میں نہ تھے جتنے رسولؐ بن کے لیٹنے سے خطرہ میں تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بھیس بدلا جاتا ہے مگر عموماً بھیس وہ اختیار کیا جاتا ہے جو خطرہ سے دور ہو مرد عورتوں کا لباس پہن کر خطرہ سے نکلا کرتے ہیں مگر یہ نیا بھیس بدلنا تھا کہ جس کی جان لینے کا منصوبہ ہو اس کا بھیس اختیار کیا جائے تو علیؑ نے یہ اتنی بڑی قربانی بحیثیت تاجر کی اور بیعنامہ خالق نے قرآن میں اتار دیا مگر یہ نجات نقاب پوش تجارت تھی جس میں خریدار خدا تھا۔

اب وہ وقت ہے جب علیؑ گوشہ نشین نہیں بلکہ خلافت ظاہری کی مسند پر ہیں۔ میثم تمار کی دوکان ہے اور علیؑ بیٹھے خرمے تول تول کر گاہکوں کو دے رہے ہیں۔

اب بتائیے کیا تجارت بری چیز ہے؟ کیا محنت ومشقت کرنے سے شرافت خاندانی جاتی رہتی ہے؟

ہمارے چھٹے امام جعفر صادقؑ ایک باغ کی دیوار کو اپنے ہاتھ سے اونچا کررہے ہیں۔ اصحاب کہتے ہیں: ''مولا! ہم دیوار بنادیں'' فرماتے ہیں نہیں میں اپنے قوت بازو سے اپنا رزق حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

دوپہر میں بازار کی طرف جارہے ہیں۔ جسم تمام پسینے سے شرابور ہے، ایک دعویدار زہد وتقویٰ نے پوچھا کہاں جارہے ہیں۔ فرمایا بازار جارہا ہوں انھوں نے کہا آپ فرزند رسولؐ ہوکر طلب دنیا کے لئے جارہے ہیں! کیا آپ کو اس کا اندیشہ نہیں کہ اسی حالت میں موت آجائے جب کہ کار دنیا میں مصروف ہیں۔ حضرت نے جواب دیا: بخدا اگر مجھے اس حال میں موت آجائے تو میں اللہ کو گواہ کروں گا کہ میں تیرے احکام کی تعمیل کی حالت میں دنیا سے گیا ہوں۔

ایک بار ایک جوان بیلچہ کاندھے پر رکھے ہوئے مسجد نبوی کے سامنے جارہا تھا۔ حاضر الوقت صحابہ میں سے کسی نے کہا، کاش اس کی جوانی راہِ خدا میں صرف ہوتی۔ رسولؐ نے کہا، تم نے کیونکر جانا کہ اس کی زندگی راہ خدا میں صرف نہیں ہورہی ہے؟ یاد رکھو اگر وہ پیٹ پالنے کے لئے جارہا ہے تو یہ اس کا عمل راہ خدا میں ہے اور اگر اہل وعیال کے لئے آزوقہ فراہم کرنے جارہا ہے تو یہ اس کا عمل اللہ کی راہ میں ہے ہاں اگر اس خیال سے جارہا ہے کہ پیسہ حاصل کرکے اپنے اور بھائیوں پر فوقیت جتاوے تو یہ عمل شیطان کے لئے ہے۔ اب یہ جس چیز کو عمل شیطان کہا گیا ہے، اس میں دنیوی سعی وکوشش کی خصوصیت نہیں ہے نماز پڑھنے میں اگر دوسروں پر فوقیت جتانا پیش نظر ہو تو وہ نماز بھی فی سبیل اللہ نہیں ہے۔

بعض مذاہب میں مشقت اٹھانا اور اپنے کو اذیت پہنچانا خود عبادت ہے۔ مثلاً ہاتھ کا اٹھائے رکھنا اور اس طرح

اسے خشک کر دینا۔ کئی کئی دن کھڑے رہنا جس سے پیروں پر ورم آ جائے یا اور طرح طرح سے جسمانی اعضا کو اذیت دینا۔ تختہ پر جس میں میخیں گڑی ہوئی ہوں، برہنہ جسم کو معلّق رکھنا، مگر اسلام دینِ عمل ہے۔ دین اذیت نہیں ہے۔ ہاتھ خشک کر لیا تو یہ ہاتھ کس نے دیا تھا؟ اللہ نے۔ اور کسی مقصد کے لئے دیا تھا تو جب ہاتھ خشک کر لیا تو ان مقاصد کو نقصان پہنچایا جن کے لئے ہاتھ عطا ہوا تھا ہاں بے شک اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَحْمَزُھَا۔ ''اعمال سب سے زیادہ افضل وہ ہے جس میں زیادہ مشقت ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں مشقت با مقصد ہونا چاہئے۔ عبادت کے لحاظ سے فضیلت اس کام کی ہے جس کے لئے مشقت اٹھائی جارہی ہے۔ خود مشقت یا اذیت اٹھانا کوئی کام نہیں اور نہ وہ خود کوئی بلند مقصد ہے مگر دوسروں کے یہاں خود مشقت یا اذیت اٹھانا عبادت ہے۔ اسی طرح جان دینا ہمارے یہاں کوئی چیز نہیں ہے۔

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جان دینا عبادت ہے اسے کہا گیا ہے۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتاً۔ جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انھیں مردہ نہ سمجھو۔ ہم اس کی تعبیر کرتے ہیں حیاتِ شہداء سے مگر قرآن میں حیاتِ شہداء کے ذکر میں لفظ شہدا نہیں ہے بلکہ معیارِ شہداء بتایا ہے۔ جو قتل ہوا اللہ کی راہ کون جانے؟ منزل مادی ہو تو راستہ مادی ہوگا۔ یہ ہے اللہ کا راستہ، اب جادہ شناس وہی ہوگا جو منزل شناس ہو لہٰذا جو اللہ کی معرفت کامل رکھتا ہو وہی اس کی راہ کا سمجھنے والا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے بغیر اذنِ معصوم جو ہو وہ جنگ ہوگی مگر جہاد نہ ہوگا۔

اگر خاندانی حمیت پر جان دی تو وہ اللہ کے لئے نہیں ہے۔ اس کا معاوضہ خاندان سے لینا چاہئے۔ اگر حمیت قومی کے لئے جان دی تو یہ اللہ کی راہ میں نہیں ہے۔ قوم سے اس کا صلہ ملنا چاہئے۔ صرف جوش میں کوئی کارنامہ ہوا تو وہ اللہ کی راہ میں نہیں ہے۔

پیغمبرِ خدا کے زمانہ میں اسامہ نے ایک کافر پر وار کیا اس نے تلوار کی زد پر آ کر کلمہ پڑھ دیا مگر ان کا ہاتھ نہ رکا اور اسے قتل کر دیا۔ حضرتؐ نے جب سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ دل سے اس نے کلمہ نہیں پڑھا تھا بلکہ جان کے خوف سے پڑھا تھا۔ آپ نے فرمایا: ھَلَّا شَقَقْتَ قَلْبَہٗ کیا تم نے اس کا دل شگافتہ کر کے دیکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ ہر قدم پر ہوش رکھنے کی ضرورت ہے، جوش سے کام نہیں چلتا۔

غرض بات تو کاروبار اور طلب معاش کی تھی۔ اب میں کتب رجال کا حوالہ دوں گا۔ اصحاب ائمہ یہ دورِ معصومینؑ کے ہمارے علماء تھے۔ ان میں سے کسی کے نام کے ساتھ طحان پیسنے والا، کسی کے نام کے ساتھ تمّار ''خرمے بیچنے والا'' کسی کے نام کے ساتھ جمال ''اونٹوں کی ساربانی کرنے والا'' کسی کے نام کے ساتھ تبّان یعنی ''گھانس وغیرہ فروخت کرنے والا'' کوئی دھّان یعنی ''گھی، تیل بیچنے والا'' اس سے ظاہر ہے کہ محنت ومشقت عزت کے خلاف نہیں ہے۔

(باقی آئندہ)